حرف زن ہوئی = بولی

دامِ گسترده = جال پھیلائے ہوئے

غیرت افزائے پنجۂ مرجاں = مونگے کی شاخوں کی شرمندگی بڑھانے والی۔ مونگا (مرجاں) سرخ رنگ کی ایک سمندری مخلوق ہوتا ہے۔ اُس کی شکل پنجے یا مٹھی کی طرح ہوتی ہے۔

سر پہ جس دم کہ
آب ہو کے بہا = جب پانی اُس کے سر پر سے گزر گیا۔

غور کرنے کی بات

عشق تازہ کار والے ٹکڑے کے پہلے شعر میں عشق کی تین صفتیں بیان کی گئی ہیں :

1. وہ تازہ کار ہے یعنی نئی نئی باتیں کرتا ہے یا ایسی باتیں کرتا ہے جو پہلے نہیں ہوئیں۔
2. وہ تازہ خیال ہے یعنی نئی نئی باتیں سوچتا ہے یا ایسی باتیں سوچتا ہے جو پہلے نہیں ہوئیں۔
3. ہر جگہ وہ نئی نئی چالیں چلتا ہے یا ہر جگہ اُس کے چلنے کا انداز اور طرح کا ہوتا ہے۔

ان باتوں کو ثابت کرنے کے لیے شاعر نے عشق کو ماضی اور حال دونوں رنگوں میں پیش کیا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ ماضی سے مستقبل کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ پھر عشق کو کہیں پر اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ کوئی کام کرتا ہوا نظر آتا ہے،

کہیں وہ اپنی شکل بدل لیتا ہے اور کہیں وہ کسی دوسری چیز کی وجہ بن جاتا ہے ؛ انسانوں اور انسانوں کی دنیا دونوں میں وہ نئی نئی باتیں کرتا نظر آتا ہے۔ اس پورے ٹکڑے کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ عشق دنیا کی سب سے طاقت ور چیز ہے اور اُس چیز کو شاعر کسی انسان یا جادوگر کی شکل میں دیکھ رہا ہے۔

دوسرے اور تیسرے ٹکڑے میں جو الفاظ ہیں وہ لڑکے اور لڑکی کی مناسبت سے الگ الگ طرح کے رکھے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ دریا کی گہرائی اور موجوں کے ڈراونے پن اور ڈوبنے والوں کی بیچارگی کو بھی اشاروں اشاروں میں ظاہر کیا ہے۔ موجیں لڑکے کے پاؤں میں زنجیر ہو جاتی ہیں۔ یہی موجیں لڑکی کے لیے کالے سانپ کی طرح بن کر اس کو جکڑ لیتی ہیں۔ لڑکے کو گوہرِ ناب یعنی سچّا موتی کہا ہے اور لڑکی کی خوب صورتی کو پانی کی موجوں پر لہراتی ہوئی چاند کی کرنوں کی طرح لکھا ہے۔ خود موتی اور چاند اور دریا ایک ہی طرح کے لفظ ہیں کیونکہ موتی پانی میں ہوتا ہے اور چاند کا اثر دریا پر پڑتا ہے۔ اسی طرح کے بہت سے الفاظ ہیں جن کا آپس میں رشتہ ہے۔ جیسے : "لہروں کا جال" کہا جاتا ہے' اس لیے عشق کو پانی کی تہ میں "دامِ گسترده" کہا ہے۔ پانی کی سطح پر جو ہلکی ہلکی لہریں ہوتی ہیں اُن کو زنجیر کہتے ہیں۔ اس لیے ڈوبنے والے لڑکے کے پاؤں میں "موجوں کا زنجیر ہو جانا" بہت خوب صورت ہے۔

"مگر" کے معنی ہیں "شاید"۔ لیکن ایک دریائی جانور بھی "مگر" کہلاتا ہے۔ شاعر کو الفاظ سے اتنی دِلچسپی ہے کہ وہ "مگر تہ آب" کا فقرہ استعمال کرتا ہے یعنی "مگر" (بمعنی مگرمچھ) اور "تہ آب" (بمعنی پانی کی گہرائی) میں ایک نئی طرح کی مناسبت بھی پیدا کر دیتا ہے۔ اسی طرح "تھا سفینے میں یا کہ دریا میں" والے مصرع میں لفظ "یا" جگہ اور وقت دونوں کی برابری ظاہر کرتا ہے۔ یعنی "وہ ابھی ابھی کشتی میں تھا اور ابھی ابھی دریا میں"۔

جیسا کہ آپ جانتے ہی ہیں "کسو" بہ معنی "کسی" اور "جاگہ" بہ معنی "جگہ" اب نہیں بولتے۔ آخری سے پہلے شعر میں "سطح" کو مذکر لکھا ہے، یہ اُس زمانے میں ٹھیک تھا لیکن اب غلط ہے۔

مشق اور مطالعہ

(1) "عشقِ تازہ کار" کے ہر مصرعے میں عشق کی ایک کارگزاری بیان کی ہے یعنی ہر شعر میں دو دو باتوں کا ذکر ہے۔ ان میں سے کچھ کا تعلق محسوس کرنے سے، کچھ کا دیکھنے سے اور کچھ کا سننے سے ہے۔ ہر طرح کی مثال میں کم سے کم دو دو شعر منتخب کر کے اپنی کاپی میں لکھیے۔

(2) اس مثنوی کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

(3) میرؔ نے عشق کی عظمت کے ثبوت میں جو کچھ کہا ہے اپنے طور پر لکھیے۔

میر غلام حسن حسنؔ

(1727 — 1786)

میر حسنؔ کے خاندان کے لوگ ایران سے آکر دلّی میں بس گئے تھے۔ یہ خاندان اتنا خوش نصیب ہے کہ اردو زبان و ادب کی بڑی بڑی خدمات اس کے ہاتھوں انجام پائیں۔ میر حسنؔ کے باپ میر غلام حسین ضاحکؔ شاعر تھے۔ میر حسنؔ خود بڑے لائق شخص اور اعلا درجے کے شاعر ہوئے۔ ان کے بیٹے میر خلیقؔ اور پھر ان کے پوتے میر انیسؔ نے اردو شاعری میں مرثیہ گوئی کی نئی نئی راہیں نکالیں۔

میر حسنؔ کچھ دنوں تک میر دردؔ کے شاگرد رہے۔ جب دلّی سے بہت سے لوگوں کا تعلق ٹوٹا تو میر حسنؔ کے باپ بھی فیض آباد چلے آئے، وہاں سے لکھنؤ پہنچے اور وہیں مرے۔ میر حسنؔ نے بہت عمدہ غزلیں بھی لکھی ہیں لیکن ان کی شہرت کا اصل دار و مدار ان کی مثنوی "سحرالبیان" پر ہے۔ اس مثنوی کو میر حسنؔ نے اپنے مرنے سے کچھ ہی پہلے مکمل کیا تھا۔ "سحرالبیان" کی شہرت اور مقبولیت کے سامنے دوسروں کی مثنویاں اور خود میر حسنؔ کی مثنویاں بڑی حد تک ماند پڑ گئیں۔

میر حسنؔ کو واقعات کی باریک تفصیلات بیان کرنے، کرداروں کو

دل چسپ ، زندہ اور متحرک شکل میں پیش کرنے اور کہانی کو مربوط طریقے سے بیان کرنے میں خاص مہارت ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں بیان کرنے کے لیے میر حسنؔ کے خزانے میں ہر طرح کے الفاظ موجود ہیں۔ ان کی مثنوی پھولوں ، پھلوں ، زیوروں ، کپڑوں اور اس طرح کی دوسری چیزوں کے ناموں سے بھری ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مثنوی کی کہانی اگرچہ بالکل خیالی داستانوں والی ہے لیکن اس کے واقعات اور کردار جیتے جاگتے اور ہماری دُنیا سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔

جو اشعار اس وقت ہمارے سامنے ہیں، ان میں پہلے اُس وقت کا بیان ہے جب شہزادہ بدرِمُنیر اپنے محل سے اچانک غائب ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد کا منظر وہ ہے جب شہزادے کی معشوقہ کی وزیرزادی نجم النّسار شہزادے کی تلاش میں جوگن بن کر نکلتی ہے۔

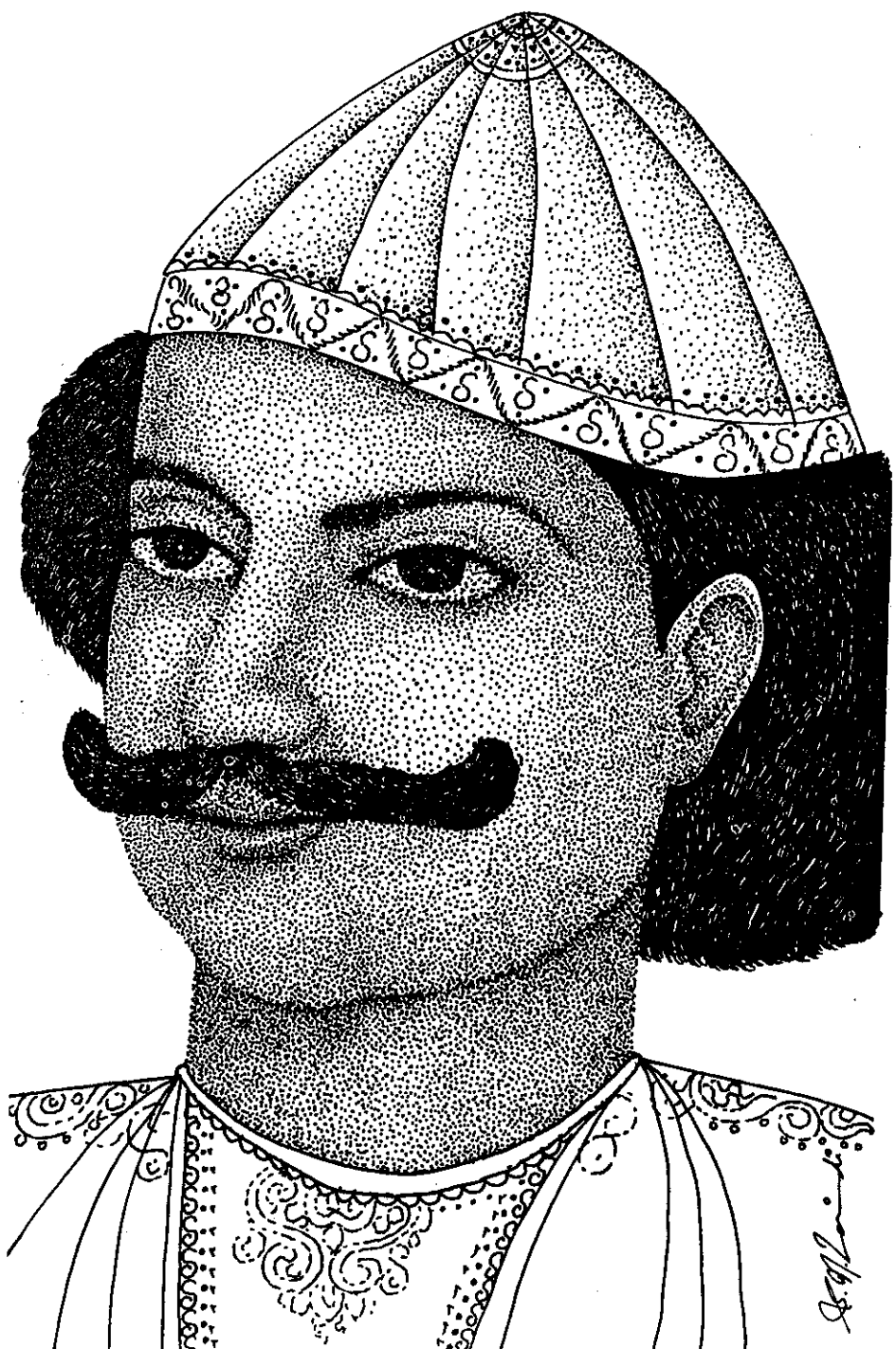

(1)

بدرِ منیر کے غائب ہونے پر ماتم

کوئی دیکھ یہ حال رونے لگی — کوئی غم سے جی اپنا کھونے لگی
کوئی بلبلاتی سی پھرنے لگی — کوئی ضُعف ہو ہو کے گرنے لگی
کوئی سر پہ رکھ ہاتھ، دل گیر ہو — گئی بیٹھ، ماتم کی تصویر ہو
رہی کوئی اُنگلی کو دانتوں میں داب — کسی نے کہا: گھر ہوا یہ خراب
کسی نے دیے کھول سُنبل سے بال — تپانچوں سے جوں گُل کیے سُرخ گال
سُنی شہ نے اَلقصّہ جب یہ خبر — گرا خاک پر کہہ کے: ہائے پسر!
کلیجا پکڑ ماں تو بس رہ گئی — کلی کی طرح سے بکس رہ گئی
کہا شہ نے: واں کا مجھے دو پتا — عزیزو! جہاں سے وہ یوسف گیا
گئے لے وہ شہ کو لبِ بام پر — دکھایا کہ سوتا تھا یاں سیم بر
یہی تھی جگہ وہ جہاں سے گیا — کہا: ہائے بیٹا! تو یاں سے گیا
مرے نوجواں! میں کدھر جاؤں پیر — نظر تو نے مجھ پر نہ کی بے نظیر!
عجب بحرِ غم میں ڈبویا ہمیں — غرض جان سے تو نے کھویا ہمیں

(2)

بدرِ منیر کے نہ ہونے پر باغ کی ویرانی

گیا جب کہ وہ سَرو اُس باغ سے — نظر پھول آنے لگے داغ سے
اکڑنا گئے سَرو سب اپنا بھول — اُڑانے لگیں قُمریاں سر پہ دھول

ہوئے خشک اور زرد سارے نہال — ثمر لگ کے پاتوں ہوئے پائمال
تبسّم، کلی حُزن سے بھول گئی — پیا غم سے از بس لہو، پھول گئی
اُڑا نور نرگس کی آنکھوں کا سب — ہوئے بال سُنبل کے، ماتم کی شب
لبِ جُو کے اُڑنے لگی گرد، گَرد — گُلِ اَشرَفی کا ہُوا رنگ زرد
پڑا ماتم اُس باغ میں بس کہ سخت — ہوئے نخلِ ماتم، تمامی درخت
لگے تھے جو پتّے درختوں کے ساتھ — وہ ہِل ہِل کے مَلتے تھے آپس میں ہاتھ
وہ لب ریز جو نہر تھی جا بہ جا — سو، آنکھوں کو وہ رہ گئی ڈبڈبا
جہاں رقص کرتے تھے طاؤس باغ — لگے بولنے اُن مُنڈیروں پہ زاغ
سُہانی وہ چھائیں جو دل چسپ تھیں — سو کیا ہو کہ اب دل لگے وہاں کہیں
منقّش جہاں تھے وے رنگیں مکاں — ہوئے سب وہ جوں دیدۂ خوں چکاں
گُلوں کی طرح کھل رہے تھے جو دِل — سو وے سب خزاں سے ہوئے مُضمحل
نہ غُنچہ، نہ گُل، نے گلستاں رہا — فقط دل میں اک خارِ ہجراں رہا
گریبان کو مثلِ گُل چاک کر — دیا خاک پر پھینک ایدھر اُدھر

(3)

نجم النّساء جوگن بنتی ہے

پھر آئے جو کچھ اُس کو ہوش و حواس — سجا تن پہ جوگن کا اُس نے لباس
پہن سیلی، اور گیروا اوڑھ کھیس — چلی بن کے صحرا کو جوگن کے بھیس
کئی سیر موتی جَلا، راکھ کر — بھبوت اپنے تن پر مَلا سر بہ سر
زری کے دوپٹّے سے چھاتی کو باندھ — بدن کو چھپا اور گاتی کو باندھ

زمرّد کے مُندرے لگا کان میں — کہ جوں سبزہ و گُل، گلستان میں
گلے بیچ ڈال اپنے مالوں کے تئیں — پریشان کر اپنے بالوں کے تئیں
زری کا بنا حلقہ سر پر رکھا — کیا سُنبلستان کو جگمگا
لٹیں دے کے بَل دوش پر موڑ دیں — وہ باگیں سی شبدیز کی چھوڑ دیں
زمرّد کی سُمرن کو ہاتھوں میں ڈال — اور اک بین کاندھے پر اپنے سنبھال
اُس آئینہ رو کا کروں کیا بیاں — صَفا، راکھ سے اور چمکی وہاں
کرے حُسن کو کس طرح کوئی ماند — چھپے ہے کہیں خاک ڈالے سے چاند
وہ موتی کی سیلی، وہ ن کی دَمک — شبِ تیرہ میں کہکشانِ فلک
زری کا وہ حلقہ سَر اوپر دھرے — کہ جوں شب میں کوئی بَنینٹی کرے
وہ مُندرے، وہ تن اُس کا خاکستری — ہوئی حُسن کی اور کھیتی ہری
اُڑے سبزہ و گُل کے دیکھ اُس کو ہوش — وے دونوں ہوئے اُس کے حلقہ بہ گوش
نظر کر صفائی کو اُس گوش کی — زمرّد کو اُس گوش کی لو لگی
بڑھے کیوں نہ ہر دم زمرّد کی شان — جب ایسے کسی کے لگے جا کے کان
وہ موتی کے مالے، وہ مونگے کے ہار — گُل و نسترن کی چمن میں بہار
وہ قشقہ کھنچا سُرخ ماتھے پہ یوں — پڑے نور پر لعل کا عکس جوں
ادا اُس کی دیکھے جو عاشق کبھو — تو رویا کرے چشم سے وہ لہو
یہ بین اُس کے کاندھے پہ تھی خوش نما — چلے جوں کوئی مست شیشہ اُٹھا

④

نجم النّسار کا جنگل میں بین بجانا

بچھا مرگ چھالے کو اورے کے بین — دو زانو سنبھل کر وہ زُہرہ جبین

کِدارا بجانے لگی شوق میں — لگی دست و پا مارنے ذوق میں
وہ سُنسان جنگل، وہ نورِ قمر — وہ بُرّاق سا ہر طرف دشت و دَر
وہ اُجلا سا میداں، چمکتی سی ریت — لگا نور سے چاند تاروں کا کھیت
درختوں کے پتّے چمکتے ہوئے — خَس و خار سارے جھمکتے ہوئے
درختوں کے سایے سے مہ کا ظہور — گرے جیسے چھلنی سے چھن چھن کے نور
ویا یہ کہ جوگن کا مُنہ دیکھ کر — ہُوا نور، سایے کا، ٹکڑے جگر
گیا ہاتھ سے بین سُن کر جو دِل — گئے سایہ و نور آپس میں مِل
وہ صورت خوش آئی جو اُس نور کی — دل اپنے پہ سایے نے منظور کی
ہَوا بندھ گئی اُس گھڑی اِس اُصول — بَسیرا گئے جانور اپنا بھول
درختوں سے لگ لگ کے بادِ صبا — لگی وجد میں بولنے واہ وا
کِدارے کا عالم یہ تھا اُس گھڑی — کہ تھی چاندنی ہر طرف غش پڑی

معنی اور اشارے

بَکَس رہ جانا = بکس کر رہ جانا یعنی تھوڑا سا کھل کر مُرجھا جانا۔

پاتوں لگنا = پتّی لگ جانا، پھل کا خراب ہوجانا۔

"ہوئے بال سنبل کے، ماتم کی شب" = (سنبل: ایک گھاس، جسے بال سے تشبیہ دیتے ہیں) غم کی وجہ سے ماتم کی رات کے مانند سیاہ ہوگئی۔ سنبل کے سیاہ ہونے کو سنبل کے بالوں کی سیاہی سے تشبیہ دی ہے۔

خوش آنا = پسند آنا

نخلِ ماتم = تابوت۔ وہ بیل بوٹے جو تابوت پر بناتے ہیں۔

رخت = لباس

سیلی = کالے رنگ کا موٹا دھاگا جو فقیر اپنے گلے میں ڈالتے ہیں۔

گاتی باندھنا = دوپٹّے یا چادر کو بدن پر کَس کر باندھنا۔

گلے بیچ ڈال اپنے مالوں کے تئیں = اپنے گلے میں مالے ڈال کر

سنبلستاں = سَر۔ سنبل ایک لمبی خوشبودار گھاس ہوتی ہے، اس لیے اس کو زلف سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اس اعتبار سے سر کو سنبلستاں کہا ہے۔

جگمگا کرنا = چمکانا

سُمرَن = تسبیح

بنیٹی کرنا = بان چھُڑانا۔ 'بان' ایک طرح کی آتش بازی ہوتی ہے جس کو آگ دے کر چکّر کی طرح گھماتے ہیں۔

کِدارا = ایک راگ کا نام

"دِل اپنے پہ سایے نے منظور کی" = سایے نے اس صورت کو اپنے دِل میں بٹھالیا یعنی سایہ روشن ہوگیا۔

غور کرنے کی بات

پہلا اور دوسرا حصّہ:

آگے بھی آپ ایک مثنوی پڑھیں گے جس میں ماں باپ ایک پیاری اولاد کا ماتم کرتے ہیں۔ دونوں کا آپس میں مقابلہ کیجیے۔ یہ بھی دیکھیے کہ میر حسن نے جہاں باغ کی ویرانی کا حال بیان کیا ہے وہاں انھوں نے کم سے کم تین طرح کے طریقے استعمال کیے ہیں: (1) باغ دراصل ویران نہیں ہے لیکن دیکھنے والوں کو ویران معلوم ہوتا ہے۔ (2) باغ کی کچھ چیزیں واقعی اُجڑ گئی ہیں۔ (3) باغ کی کچھ چیزیں اپنی اصلی حالت میں بیان کی گئی ہیں لیکن ان کا مطلب کچھ اور نکالا گیا ہے۔ تینوں طرح کے کچھ اشعار چُن کر اپنی کاپی میں لکھیے۔

تیسرا حصّہ:

نجم النّساء کے جوگن بننے کے بیان میں بھی تین طرح کی باتیں ہیں: (1) نجم النّساء کے کپڑوں، زیوروں اور شکل وصورت کا بیان (2) نجم النّساء کی خوب صورتی کا دوسروں پر اثر (3) نجم النّساء کے زیور اور دوسری چیزیں نجم النّساء کے جسم پر ہونے کی وجہ سے اور بھی اچھّی لگتی ہیں۔ تینوں طرح کے کچھ شعر ڈھونڈ کر اپنی کاپی میں لکھیے۔

چوتھا حصّہ:

چاندنی رات کا جتنا خوب صورت بیان ان اشعار میں ہے اُس کی مثال اردو شاعری میں نہیں ملتی۔ حصّہ نمبر تین اور حصّہ نمبر چار میں بہت سے الفاظ بھی ایسے ہیں جو نئی نئی باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مثلاً: نجم النّساء کی خوبصورتی بیان کرنے کے لیے آئینہ، چاند، تارے، آتش بازی اور علمِ نجوم سے متعلق الفاظ

استعمال ہوئے ہیں۔ چاندنی رات کے بیان میں زیادہ تر الفاظ ایسے ہیں جو جنگل میں ہَوا کے چلنے اور چھوٹی بڑی چیزوں کے چاندنی میں جھمکنے کی کیفیت دیتے ہیں۔

مشق اور مطالعہ

(1) چاندنی رات کے ان منظروں کو نثر میں بیان کیجیے۔

(2) مثنوی میں بیان کردہ باغ کی تفصیلات اپنے الفاظ میں لکھیے۔

(3) اپنے استاد سے معلوم کرکے اس داستان کا خلاصہ تحریر کیجیے۔

نواب مرزا شوق

(1783 — 1871)

نواب مرزا کا اصل نام تصدّق حسین خاں تھا، لکھنؤ کے ایک معزّز گھرانے کے فرد تھے۔ اُن کا خاندانی پیشہ طبابت تھا۔ شاعری میں وہ آتش کے شاگرد تھے۔ وہ اپنے وقت کے مشہور حکیم بھی تھے لیکن اردو ادب کی تاریخ میں اُن کی شہرت تین مثنویوں کی بِنا پر ہے۔ اُن میں سے دو مثنویاں "فریبِ عشق" اور "بہارِ عشق" 1846 اور 1847 کی تصنیف ہیں۔ تیسری مثنوی "زہرِ عشق" جو سب سے زیادہ مشہور ہے 1860 اور 1862 کے درمیان لکھی گئی۔

"زہرِ عشق" ایک، بے نام نوجوان لڑکی اور لڑکے کی محبّت کی چھوٹی سی کہانی ہے۔ اس میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں، لیکن نظم میں اثر اور کیفیت اس قدر ہے کہ عشق و محبّت کی ذرا ذرا سی باتیں بھی سچّی اور اصلی معلوم ہوتی ہیں۔ شاید اسی بِنا پر اس مثنوی کا پڑھنا عیب سمجھا جاتا تھا اور انگریزوں نے اس کی اشاعت پر پابندی لگادی تھی۔ اردو میں ہزاروں کتابیں ایسی ہیں جن میں ان معاملات کو بہت کُھل کر بیان کیا گیا ہے اور ان کے سامنے "زہرِ عشق" بالکل سادہ اور معصوم معلوم ہوتی ہے۔ یہ شاعر کا کمال ہے کہ سچّائی کے ساتھ ان واقعات کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ یہ مثنوی نہایت پُراثر بن گئی ہے۔